غیاث متین

دھوپ دیواریں سمندر آئینہ

شعری مجموعہ

دھوپ، دیواریں، سمندر، آئینہ

غیاث متین

○ سنہ اشاعت : ۵ دسمبر ۱۹۹۳ء

○ بارِ اوّل ـــــ پانچ سو

○ سرورق : عزیز آرٹسٹ

○ خوشنویسی : سلام خوش نویسؔ

[illegible]

طباعت : اسپیڈ پرنٹس، آفسیٹ پرنٹرس اینڈ بائنڈرس ☏ 873538

○ قیمت : ساٹھ روپے

○ ناشر : مکتبۂ شعر و حکمت

6-3-659/2 سائیان ۔ کپاڈیہ لین ۔ پنجہ گٹہ ۔ حیدرآباد 482 500

○ تقسیم کار :

○ حسامی بُک ڈپو، مچھلی کمان ۔ حیدرآباد

○ حیدرآباد لٹریری فورم حلقہ ڈریس لینڈ، عابڈس حیدرآباد ۱

○ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر ۔ نئی دہلی

شاخیں ـــــ علی گڑھ، دہلی، بمبئی

○ شب خون کتاب گھر ۔ رانی منڈی ۔ الٰہ آباد

○ نصرت پبلشرز، حیدری مارکٹ ۔ امین آباد ۔ لکھنؤ

○ ایجوکیشنل بُک ہاؤز، مسلم یونیورسٹی مارکٹ ۔ علی گڑھ

○ بُک ایمپوریم ۔ سبزی باغ ۔ پٹنہ

○ مصنّف : 16-8-536/3 جدید ملک پیٹ ۔ حیدرآباد

جزوی اعانت : اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش حیدرآباد

DHOOP, DEEWAREN, SAMMANDER, AAINA
GHYAS MATEEN
Edition: 1993 - Price: Rs 60/-
Publisher
MAKTABA-E-SHER-O-HIKMAT
Somajiguda, Hyderabad-500 482

اِنتساب

حیدرآباد لِٹریری فورم

"حلف"

کے

نام

یہ میرا خواب بھی ہے اور تعبیر بھی

معنون

نئی نسل

کے

نام

جس کے شعری ذوق پر مجھے بھرپور اعتماد ہے

فہرست

آئینہ بن کے بات کرتی دُھوپ ۱۳
اکیلا گھر ہے کیوں رہتے ہو، کیا دیتی ہیں دیواریں ۱۵
پاگل سی ہوا، ڈھلتی ہوئی شام سمندر ۱۷
دیکھتا ہے جب بھی پتھر آئینہ ۱۹
پروں کو اب نہ پھیلاؤ پرندو ۲۱
آ کے پلکوں پہ تھم گیا، جگنو ۲۲
ہم سے کیا پوچھتے ہو، کیا ہے رات ۲۳
کیوں کسی کو ڈھونڈتے ہو ہاتھ میں لے کر چراغ ۲۴
کہیں چراغ، کہیں آئینہ بنا اخبار ۲۵
اپنے کمرے ہی میں بیٹھا رہا، کورا کاغذ ۲۶
کہیں خیال، کہیں خواب سا ملا دریا ۲۷
بھیگنے کا اِک مسلسل سلسلہ بارش میں ہے ۲۸
اکیلی پھرتی ہے آنکھوں میں لے کے پانی شام ۲۹
شام کا رنگ جو گہرا ہُوا آئینے میں ۳۰
میرے احساس کی نکہت، مرے فن کی خوشبو ۳۱
کاغذوں کے ٹکڑوں سے آئینہ بناتے ہیں ۳۲
اب جو ملتا ہے تو وہ شخص کھنڈر لگتا ہے ۳۳
خُشک دریاؤں کو پانی دے گیا ۳۴
نیند کب اچھی لگی، کب جاگنا اچھا لگا ۳۵
دریا سے بچانا، نہ سمندر سے بچانا ۳۷
ہرا دوسرا رُخ دکھا دے مجھے ۳۸
کاغذ اُچھال کر ذرا تیور ہوا کے دیکھ ۳۹
جن سے آواز کا چہرہ نہیں دیکھا جاتا ۴۱
اِس طرف آگ کا دریا ہے، اُدھر کھائی ہے ۴۳
اِن پرندوں سے سبق سیکھا کرو ۴۵
مَیں سوچوں تجھ کو اور سوچا نہ جائے ۴۷
اب یہ حسرت ہے کہ منظر کوئی ایسا دیکھوں ۴۸
وہ چنگاریوں کو ہوا دے گیا ۴۹
موسموں کی طرح دِل سے مرے جانے والا ۵۰
آئینہ مانگوں تو کیسی وہ سزا دیتا ہے ۵۲

غزلیں

لہجے کو پھول، لفظ کو جگنو، اگر کریں ۵۳
کوئی سایہ، نہ خوشبو، مگر دیکھنا ۵۴
شعلے بجھ جائیں گے، چنگاری دبی رہ جائے گی ۵۶
یہی نہیں کہ فقط دربدر گئے ہوتے ۵۷
خود اپنے شکنجے میں گرفتار نہ ہونا ۵۸
کیا ہوا پوچھیں، تو وہ کچھ بھی نہیں کہتی ہے ۶۰
دل جلا پھر چراغ جلتے ہیں ۶۲
دشمن کو بھی یار بنا کر دیکھیں گے ۶۴

نظمیں

سفر ہے شرط ۶۸
زخمی سڑک ۷۲
شہر یار امروز ۷۶
صدائے طور ۸۰
وقت ۸۴
وہ قاصد مر چکا ہے ۹۰
ریس ۹۲
کھل جا سِم سِم ۹۵
پرندو، چلو لوٹ آؤ ۹۷
اپنے آپ سے ایک مکالمہ ۱۰۰
ایک نظم ــــ زمین والوں کے نام ۱۰۴
وہ ایسا آئینہ تھا ۱۱۲
بولتی لکیریں ۱۱۷
کلام رو رہا ہے ۱۲۰
ایک نظم ــــ انور رشید کے نام ۱۲۴
تمہاری گفتگو ہو گی چراغوں سے ۱۲۶



اپنے پہلے شعری مجموعے "زینہ زینہ راکھ" ۱۹۸۰ء کی اشاعت کے تیرہ سال بعد یہ دوسرا شعری مجموعہ ــــ "دھوپ، دیواریں، سمندر، آئینہ" ــــ اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے، مَیں بڑی مسرت محسوس کر رہا ہوں۔ اِن تیرہ برسوں میں، جدید اظہار نے نہ صرف اپنے عصر کو متاثر کیا ہے بلکہ اپنے آپ کو منوا لیا ہے۔

پچھلے مجموعے میں غزلیں بھی شامل تھیں جو تعداد میں بہت کم تھیں ــــ غالباً اسی لیے میری شناخت ایک نظم گو کی حیثیت سے ہوئی۔ باذوق قاری اور نقّادانِ فن کی جانب سے جدید نظم گو شاعر کی حیثیت سے میری جو پذیرائی ہوئی، اُس نے مجھے حوصلہ بخشا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد شعوری یا لاشعوری طور پر میں نے غزل کی جانب توجہ کی ــــ غزل جو ایک جادوئی صنف ہے، اپنے اندر ایک جہانِ معانی رکھتی ہے۔ پچھلے بیس پچیس برسوں میں غزل نے اپنے اُسلوب اور اظہار کے امکانات کو وسیع سے وسیع تر کیا ہے۔ عصری آگہی اور اس کے مسائل نے جدید غزل گو شاعر کے اظہار اور اس کے وِژن کو ذات اور کائنات سے ہم رشتہ و ہم آہنگ کر دیا ہے ــــ جدید غزل نے پچھلی رُبع صدی کے دوران جس طرح اپنے آپ کو منوایا ہے، اس طرح پوری اُردو شاعری کی تاریخ میں کسی اور صنف نے اپنے آپ کو نہیں منوایا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ، غزل کی اندرونی ہیئت میں تبدیلی ہے، جس میں اظہار کے اُسلوب، استعاراتی اور علامتی اندازِ بیان، نئے الفاظ اور تراکیب کی شمولیت، نئی زبان کی تخلیق، روزمرّہ واقعات اور مسائل کا تخلیقی اظہار، سبھی کچھ شامل ہے۔ اپنے ہمعصر جدید غزل گو شعراء کی طرح مَیں نے بھی غزل کا

اندرونی ہیئت کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔

میری شاعری میں لفظ کو اس کے لغوی اور اکہرے معنی میں استعمال کرنے کے بجائے اُسے علامت اور استعارے کے طور برتنے کا عمل آپ کو ملے گا۔ "دُھوپ، دیواریں، سمندر، آئینہ" صرف چار لفظوں پر مشتمل ایک مصرعہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ اپنی جگہ مکمل استعارے اور علامتیں ہیں، جن کا ہمارے تمدّن کی تاریخ سے راست تعلق ہے۔ گویا یہ استعارے اور علامتیں اپنے تمدّن کی تاریخ کا مظہر ہیں۔ ان کلیدی استعاروں اور علامتوں کے علاوہ، میری شاعری میں، موسم، پرندے، دریا، شجر، ثمر، جگنو، رات، شام، چراغ، کاغذ، پتّھر، شاخ، پھُول، پتّے، پھَل، تنہائی، دہلیز، گھر اور ایسے ہی دیگر الفاظ، کہیں انفرادی اور اجتماعی لاشعور کے عَلائم ہیں۔ کہیں ذات اور کائنات کے حیرت زا مظاہر کی استعاراتی تصویریں تو کہیں میرے عَصر کے، سیاسی، سَماجی اور تہذیبی عناصر، عوامل اور مَسائل کے تخلیقی اظہار کی علامتیں ہیں۔ مَیں نے اس مجموعے کی ابتدائی چند غزلوں میں استعاروں اور علامتوں ہی کو ردیف بنانے کا تجربہ کیا ہے۔ یہ تجربہ کوئی نیا نہیں ہے ـــــ اساتذہ اور خاص طور پہ جدید تر شعراء کے ھاں اس طرح کے نمونے بھی مِل جاتے ہیں۔ لیکن اتنی بڑی تعداد میں کسی ایک شعری مجموعے میں اِس طرح کی ردائف کا استعمال شائد پہلی بار ہوا ہے۔

تخلیقی عمل ایک نہایت ہی پیچیدہ عمل ہے جس میں صرف تخلیق کار کی ذات موجود رہتی ہے۔ اِس سلسلے میں نہایت اختصار کے ساتھ صرف اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تخلیقی عمل کے ابتدائی مَرحلے پر میرے ذہن میں کوئی Image اپنی مکمل شکل میں دَر آتا ہے، جسے مَیں لفظوں کا پیرہن دے دیتا ہوں۔ دوسرے معنٰی میں، اپنی غزلوں کے بیشتر اشعار میں، شعوری یا لاشعوری طور پہ میں نے Images کی تخلیق کی ہے۔ اِن اِمیجس سے جو شعری پیکر مَیں نے تراشے ہیں اگر اُن کی ترسیل میں کامیاب رہا ہوں تو اِسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔

جہاں تک نظم کا سوال ہے ـــــ نظم اپنی ایک شناخت بلکہ شخصیت رکھتی ہے ـــــ جس کی تشکیل موضوع اور ہیئت کی ہم آہنگی سے ہوتی ہے۔ اِس مجموعے میں شامل اپنی نظموں میں میرا

تخلیقی عمل پیکر کی تجسیم ہے۔ کوشش میں نے یہی کی ہے کہ موضوع اور ہیئت میں ہم آہنگی پیدا کرسکوں۔ اِس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، یہ تو آپ ہی بتا سکیں گے۔

آیئے، ___ میرے تخیّل کے سمندر میں بنی ہوئی ان دیواروں سے صفحۂ قرطاس پر اُترتی ہوئی احساس کی دُھوپ کو پی کر اِس آیئنے میں جھانکیں جو میری تخلیق بھی ہے اور میری ذات کا اظہار بھی!

ناسپاس گزاری ہوگی، اگر میں استاذی محترم ڈاکٹر مغنی تبسّم کا شکریہ ادا نہ کروں۔ جن کی شفقت میری ذہنی تربیت اور شعری ذوق کا حصّہ ہے۔ سلام خوش نویس کی خوش نویسی اور عزیز آرٹسٹ کے سرورق نے اِس مجموعہ کے ظاہری حُسن میں اضافہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ میرے عزیز دوستوں محمود انصاری، ایڈیٹر روزنامہ مُنصف، حیدرآباد ___ ڈاکٹر بیگ احساس، ریڈر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی ___ ڈاکٹر مقبول فاروقی، ریڈر شعبۂ اُردو آندھرا یونیورسٹی وشاکھاپٹنم نے اس مجموعے کی ترتیب میں میرا ہاتھ بٹایا، اور مفید مشوروں سے نوازا، ___ جس کے لیے مَیں ان سب کا شکرگزار ہوں۔

(غیاث متین)

دسمبر ۱۹۹۳ء
حیدرآباد

شہر کب آئے، کہاں ٹھہرے ہو، یہ کیا حال ہے
اُس کا مجھ کو روک کر یہ پُوچھنا اچھا لگا

غیاث متین


غزلیں

اپنے لہجے کی یہی پہچان ہے
دھوپ، دیواریں، سمندر، آئینہ

غیاث متین



آئینہ بَن کے بات کرتی دُھوپ
دِل کی دیوار پر بَرستی دُھوپ

میرے اندر بھی دُھوپ کا عالَم
میرے باھر بھی رقص کرتی دُھوپ

اُس کی آنکھوں میں خیمہ زن دیکھی
ایک اِک بُوند کو ترستی دُھوپ

آئینہ دیکھ کر ٹھٹکتی ہے
گھر کی دیوار سے اُترتی دُھوپ

طاقِ ماضی میں چُھپ کے بیٹھی ہے
خَوف سے کانپتی، لَرزتی دُھوپ

صُبح کو شام سے ملاتی ہے
رقص کرتی ہوئی، بِھرکتی دُھوپ

خواب ہے یا سراب ہے کیا ہے
اپنے ہی عکس کو ترستی دُھوپ

عکس آنکھوں میں چھوڑ جاتی ہے
سامنے سے مِرے گزرتی دُھوپ

آئینہ بھی ہے اور سمندر بھی
میرے احساس میں اُترتی دُھوپ

مَیں بھی اُس کی زباں سمجھتا ہُوں
جب بھی مُجھ سے ہے بات کرتی دُھوپ

اپنا لہجہ متین ایسا ہے
جیسے دریاؤں میں اُترتی دُھوپ!



اکیلا گھر ہے، کیوں رہتے ہو، کیا دیتی ہیں دیواریں
یہاں تو ہنسنے والوں کو، رُلا دیتی ہیں دیواریں

انھیں بھی اپنی تنہائی کا جب احساس ہوتا ہے
تو گہری نیند سے مجھ کو، جگا دیتی ہیں دیواریں

مجھے ماضی کا کھلتے حال سے رشتہ عجب دیکھا
کھنڈر خاموش ہیں لیکن صدا دیتی ہیں دیواریں

ہوا کے زخم سہہ کر بارشوں کی چوٹ کھا کھا کر
چھتوں کو، روزنوں کو آسرا دیتی ہیں دیواریں

رہوں گھر میں تو میرے سر پہ چادر تان دیتی ہیں
سفر پہ جب نکلتا ہوں دُعا دیتی ہیں دیواریں

جو چلنا ہی نہ چاہے، روک لیتے ہیں اُسے ذرّے
بگولوں کو سفر میں راستہ دیتی ہیں دیواریں

وہ ساری گفتگو جو بند کمروں ہی میں ہوتی ہے
مَیں جب باہر سے آتا ہوں سُنا دیتی ہیں دیواریں

اُترتی اور چڑھتی دُھوپ کی پہچان ہے اِن کو
ابھی دِن کتنا باقی ہے بتا دیتی ہیں دیواریں

متینؔ اِس چلچلاتی دُھوپ میں سایہ اِنہی سے ہے
مَیں جب بھی ٹُوٹتا ہوں، حوصلہ دیتی ہیں دیواریں



پاگل سی ہوا، ڈھلتی ہوئی شام، سمندر
ایسے میں کہیں لے نہ ترا نام، سمندر

ویرانوں میں بھٹکیں کہ ترے شہر میں ٹھیریں
آنکھوں میں در آتا ہے سرِ شام سمندر

ہے تازہ ہواؤں پہ یہ الزام کہ چپ ہیں
کچھ ایسا ہی تجھ پر بھی ہے الزام سمندر

کاغذ کی بنی ناؤ میں بیٹھے ہوئے ہم لوگ
گرداب سے نکلے ہیں، ذرا تھام سمندر

دے اذن کہ پانی پہ مکاں اپنے بنائیں
اب ساری زمیں ہو گئی نیلام سمندر

سُنتے ہیں وہاں عکس اُبھرتے ہیں بدن کے
چلتے ہیں چلو ہم بھی سرِ شام سمندر

کس وقت زمیں میرے قدم لینے لگی ہے
جب رہ گیا مٹّی سے بس اِک گام سمندر

تُو عکسِ فلک ہے تو فلک آئینہ تیرا
اِک رقصِ مُسلسل ہے ترا کام سمندر

چڑھتے ہوئے دریا ہوں کہ سُوکھی ہوئی نہریں
رکھتے ہیں ترے سر سبھی اِلزام سمندر

کیا بھر گئے پانی سے لبالب کہ تہی
دینے لگے صحراؤں کو دُشنام سمندر



دیکھتا ہے جب بھی پتھر آئینہ
بات کرتا ہے سنبھل کر آئینہ

آئینے سے دوستی اچھی نہیں
کہہ رہا ہے میرے مُنہ پر آئینہ

چلتے پھرتے منظروں کا سلسلہ
آئینہ، در آئینہ، در آئینہ

ہیں سبھی دیوار سے لٹکے ہُوئے
وقت، تصویریں، کیلنڈر، آئینہ

شام کے ہونٹوں پہ سُرخی کی لکیر
رات کے پردوں کے اندر آئینہ

کوئی اس سے ٹوٹ کر ملتا نہیں
جاگتا رہتا ہے شب بھر آئینہ

اُن کی آنکھوں کا مقدّر دھوپ ہے
میری آنکھوں کا مقدّر آئینہ

اپنے لہجے کی یہی پہچان ہے
دھوپ، دیواریں، سمندر، آئینہ

عکس جس کو تم سمجھتے ہو مُبین
آئینے کے بھی ہے اندر آئینہ



پَروں کو اب نہ پھیلاؤ، پرندو
ہے بارش تیز، گھر جاؤ، پرندو

سمندر، دانہ دانہ جب بکھیرے
سمندر میں اُتر جاؤ، پرندو

وہ موسم تو نہ آئیں گے پلٹ کر
چلو، اب لوٹ بھی آؤ، پرندو

مجھے سُرخاب کے پَر کی ہے خواہش
کہیں سے ڈھونڈ کر لاؤ، پرندو

ہَواؤں میں مسّین اُڑنے لگا ہے
ذرا تم اِس کو سمجھاؤ، پرندو



آ کے پلکوں پہ تھم گیا، جگنو
میرے انفاس میں بسا جگنو

میری مُٹھی میں بند ہے اب تک
تیری یادوں کا بے بہا، جگنو

میری پلکوں پہ جگنوؤں کے چراغ
اُس کی آنکھوں میں بجھ گیا، جگنو

حافظے میں چمکتا رہتا ہے
وہ جو بچپن میں ساتھ تھا، جگنو

سرد پلکوں پہ جھلملاتا ہے
ایک آنسو، چراغ سا، جگنو

بات مجھ سے سستین کرتا ہے
دِل کی دیوار سے لگا، جگنو



ہم سے کیا پُوچھتے ہو کیا ہے، رات
اُس کی باتوں کا سِلسلہ ہے، رات

آسماں تک جو لے کے جاتا ہے
ایک ایسا ہی راستہ ہے، رات

فلسفہ رات کا بَس اتنا ہے
اِک عجوبہ ہے، معجزا ہے، رات

رات کو تم حقیر مَت جانو
دِن اگر جسم ہے، رِدا ہے رات

رات آنکھوں میں کاٹنے والو،
اِک تم ہی جانتے ہو، کیا ہے، رات

رات کا رنگ، رات کی خوشبو
کون محسوس کر سکا ہے، رات

رات سو کر گزارتے ہو مستینؔ!
تم کو معلوم بھی ہے کیا ہے، رات



کیوں کسی کو ڈھونڈتے ہو، ہاتھ میں لے کر چراغ
اب کہاں وہ گاؤں، ہوتے تھے جہاں گھر گھر چراغ

دیکھنا اُس کو اگر ہے، اِن چراغوں کو بجھاؤ
کیسے دیکھو گے اُسے تم، سامنے رکھ کر، چراغ

مَیں نے چُپکے سے کہی، اِک بات اُس کے کان میں
اُس نے اپنے ہاتھ سے گُل کر دیا ہنس کر چراغ

اب جو لوٹا ہوں تو سب حیرت سے تکتے ہیں مجھے
جام و مینا، گُنبد و محراب، بام و دَر، چراغ

آج تو اُن کی نظر کے واسطے سو رنگ ہیں
کل پرندوں کے لیے ہوتے تھے بال و پَر، چراغ

شب تو اندھی ہے رہے گی عُمر بھر اندھی متین
یا جلو تم شام سے یا پھر جلیں دِن بھر چراغ



اپنے کمرے ہی میں بیٹھا رہا کورا کاغذ
آئینہ دیکھ کے روتا رہا کورا کاغذ

جب کئی چہرے اسے دیکھ کے مُنہ پھیر گئے
اپنے اندر ہی سُلگتا رہا کورا کاغذ

گھر میں جب اس کے لیے کوئی جگہ ہی نہ رہی
بادلوں کی طرح اُڑتا رہا کورا کاغذ

کوئی آئے، کوئی دیکھے کہ یہاں صدیوں سے
اپنی ہی آگ میں جلتا رہا، کورا کاغذ

کورے کاغذ کا کہاں تک لکھوں احوال متین
سانس لینے کو، ترستا رہا کورا کاغذ



کہیں خیال، کہیں خواب سا، ہلا دریا
مرے وجود کا اظہار بن گیا دریا

ندی، سکون سے محوِ سفر رہی لیکن
قدم قدم پہ مگر ہانپتا رہا دریا

اُسے میں اپنے خیالوں میں قید کر نہ سکا
مرے خیال سے آگے نکل گیا، دریا

ندی نے مُڑ کے سمندر کی سمت دیکھا تھا
تو اُس کی راہ میں دیوار بن گیا، دریا

بڑا غرور تھا اپنے وجود پر اِس کو
ملا جو آ کے، سمندر سے کھو گیا، دریا

وہ شخص ریت میں، مُنہ کو چھپائے بیٹھا ہے
متینؔ اُس کو ڈبو دے نہ ریت کا دریا



بھیگنے کا اِک مُسلسل سِلسلہ، بارش میں ہے
کیا کسی موسم میں ہوگا جو مزا، بارش میں ہے

یُوں کُھلی سڑکوں پہ مت پھرنا کہ موسم غیر ہے
اِک تو موسم غیر، پھر ٹھنڈی ہَوا، بارش میں ہے

آسماں کا عکس پانی میں اُترتے ہی کُھلا
آئینے کے سامنے، اِک آئینہ، بارش میں ہے

ایسا منظر بس اِسی موسم میں دیکھا جائے ہے
اِک کنارا دُھوپ میں اور دوسرا بارش میں ہے

سانس لیتے پھول، لچکتی ٹہنیاں، ہنستے گلاب
ایسا منظر بھی سرِ شاخِ حیا، بارش میں ہے

مُعجزے سے کم نہیں، یہ زندگی اپنی متینؔ
جیسے تاریکی میں اِک جلتا دِیا، بارش میں ہے



اکیلی پھرتی ہے آنکھوں میں لے کے، پانی، شام
متین، ہم سے نہ دیکھی گئی، دِوانی شام

نظر کے سامنے، پھیلی ہوی، سُہانی، شام
پلک جھپکتے ہی ہو جائے گی، کہانی، شام

یہ سِلسلہ تو زمانے سے ہے یونہی، جاری
بُڑھاپا رات ہے، بچپن ہے دِن، جوانی، شام

ہے اِس میں ایسی پُر اسراریت کہ مت پُوچھو
کہانیوں کی کہانی، عجب کہانی، شام

کسی کا عکس جو پانی میں آج دیکھا ہے
تو یاد آ گئی، بھُولی ہوی، پُرانی شام

پگھلتی ریت کے ذرّوں میں خواب کے موتی
یہ جاتے جاتے، مجھے دے گئی، نشانی شام



شام کا رنگ جو گہرا ہُوا آئینے میں
اِک ستارہ سا چمکنے لگا، آئینے میں

سب کھلونوں کی طرح ٹُوٹ رہے ہیں پَل پَل
اور یہ منظر مجھے ڈستا ہُوا، آئینے میں

گردشِ وقت سنبھلنے نہیں دیتی، مجھ کو
سِلسلہ ٹُوٹتا، بَنتا رہا، آئینے میں

دیکھ کر لہروں کی شوریدہ سَری، یاد آیا
ایک چہرہ، کبھی دیکھا ہُوا، آئینے میں

اُس کی آنکھوں میں اُترتے ہوئے محسوس ہُوا
اِک نئے شہر کا رستہ مِلا، آئینے میں

آئینہ دیکھ کے کیوں چیختے رہتے ہو متین
کیا کوئی اور ہے بیٹھا ہوا، آئینے میں



میرے احساس کی نکہت، مرے فن کی خوشبو
اے خدا تو نے ہی بخشی ہے، سخن کی خوشبو

جیسے پانی میں اُترتی ہے کرن، سورج کی
مجھ میں اُتری ہے ترے سانولے پن کی خوشبو

زندگی، سازِ مسرت پہ ہو رقصاں بھی تو کیا
درد ہی سے ہے یہاں گیسوئے فن کی خوشبو

مَیں نے پہنا ہے تجھے اپنے لباسوں کی طرح
کیسے بھولے گی مجھے تیرے بدن کی خوشبو

میرا اظہار علامت ہے نئے لہجے کی
تم بھی محسوس کرو، میرے سخن کی خوشبو

شاذ[1] و مخدوم[2] و اریب[3]، اختر[4] و جامی[5] سے یہیں
دُور تک پھیل گئی، ارضِ دکن کی خوشبو

[1] شاذ تمکنت [2] مخدوم محی الدین [3] سلیمان اریب [4] ڈاکٹر وحید اختر [5] خورشید احمد جامی

(نذرِ کمار پاشی)

کاغذوں کے ٹکڑوں سے آئینہ بناتے ہیں
ہم ہیں کیسے دیوانے، کیا سے کیا بناتے ہیں

وہ عصائے موسیٰ تھا، یہ قلم ہمارا ہے
اِس سے ہم بھی پانی میں راستہ بناتے ہیں

اب ہماری بستی کا حشر بھی وہی ہوگا
اب ہمارے بچّے بھی زائچے بناتے ہیں

آنکھ، خواب، تنہائی، دُھوپ، ریت، سنّاٹا
اِن پُرانی اینٹوں سے گھر نیا بناتے ہیں

ہم اُداس موسم کے آخری پرندے ہیں
بَرف زار پر اپنے نقشِ پا، بناتے ہیں

تتلیوں کے پَر جیسے، خواب ہیں مستینؔ اپنے
ہاتھ بھی نہیں آتے، سِلسلہ بناتے ہیں!

(بشیر بدر کی نذر)

اب جو ہلتا ہے تو وہ شخص کھنڈر لگتا ہے
اُس کی ٹوٹی ہوئی آواز سے ڈر لگتا ہے

شاخ سے ٹوٹ کے پھل گرنے کا موسم آیا
اب سنبھالے سے نہ سنبھلے گا شجر لگتا ہے

ریت پر اب جو چمکتے ہیں زمرّد کے چراغ
یہ مری آبلہ پائی کا ثمر لگتا ہے

دھوپ، دیوار سے ہل ہل کے گلے روتی ہے
اب کی بارش میں بچے گا نہ یہ گھر لگتا ہے

اپنی ہی ذات کے اندر کا سفر خوب سہی
قاف تا قاف سفر ہو، تو سفر لگتا ہے

وقت، ہونٹوں پہ دعا بن کے لرزتا ہے متین
آج کھل جائے گا وہ بابِ اثر، لگتا ہے!



خشک دریاؤں کو پانی دے گیا
یاد کا موسم، نشانی دے گیا

دھوپ کے چہرے پہ بارش کی لکیر،
کیسا منظر تھا، کہانی دے گیا

وقت بھی کتنا ستم ایجاد ہے
اپنے گھر کی پاسبانی دے گیا

وہ تو آیا تھا، رُلانے کو مگر
عمر بھر کی شادمانی دے گیا

خواب کے سارے پرندے اُڑ گئے
وقت، تعبیریں پرانی دے گیا

زخم پہلے بات کرتے تھے متین
کون اِن کو بے زبانی دے گیا!



نیند کب اچھی لگی، کب جاگنا اچھا لگا
میری آنکھوں کو وہی اِک آئینہ اچھا لگا

جب بھی بازاروں سے گُزروں تو مجھے پہچان کر
آئینوں کا میری جانب دیکھنا اچھا لگا

جانتے ہیں، رنگ اپنا ہے، نہ پَر اپنے مگر
تتلیوں کے پیچھے پیچھے دَوڑنا اچھا لگا

شہر کب آئے، کہاں ٹھیرے ہو، یہ کیا حال ہے
اُس کا مجھ کو روک کر یہ پُوچھنا اچھا لگا

خُشک پتے ہیں، ہَوا اِن کو اُڑا لے جائے گی
دُشمنوں کو دیکھ کر یہ سوچنا اچھا لگا

اُس کی آنکھوں میں کچھ ایسی بات تھی جس کے سبب
شام ہوتے ہی مجھے گھر لوٹنا اچھا لگا

دُھوپ ایسی تھی کہ دروازے پہ آ کر رُک گئی
میرے گھر کو یارشوں کا آسرا اچھا لگا

رات کا ٹو' اجنبی شہروں میں تو محسوس ہو
کیسے ہم کو جنگلوں میں جاگنا اچھا لگا

ورنہ منظر ہی کوئی ہوتا نہ پس منظر متین
اِس زمیں سے آسماں کا فاصلہ اچھا لگا



دَریا سے بچانا، نہ سمندر سے بچانا
دیوار کو، دیوار کے پتّھر سے بچانا

پانی میں کہیں لاش، کنارے پہ کھڑے لوگ
اِس شہر کو ایسے کسی منظر سے بچانا

پوشیدہ جہاں بھی ہے یتیموں کا خزانہ
مجھ کو اُسی دیوار کی ٹھوکر سے بچانا

اِک کھیل تھا بچپن کا جو باقی ہے ابھی تک
پتّھر کوئی آئے تو اُسے سر سے بچانا

جس کے دَر و دیوار پہ آئینے لگے ہیں
اب مجھ کو بچانا تو اُسی گھر سے بچانا

یہ دَور عجب ہے کہ یہاں سہل نہیں ہے
جس پیڑ پہ پھل ہوں اُسے پتّھر سے بچانا

اب اپنے خُدا سے یہی کہنا ہے متینؔ آج
مُجھ میں جو چھُپا ہے مجھے اُس شر سے بچانا



مرا دوسرا رُخ دِکھا دے مجھے
مرے سامنے سے ہٹا دے مجھے

بڑی دیر سے قید میں ہوں ترِی
پرندہ سمجھ کر اُڑا دے مجھے

مَیں اُس کے لیے دُھوپ لے آؤں گا
جو دریا سے پانی پلا دے مجھے

مَیں اُڑنا سکھاؤں گا تجھ کو مگر
تُو پانی پہ چلنا سِکھا دے مجھے

سمندر سے نسبت ہے مجھ کو متین
وہ سُورج اگر ہے جَلا دے مجھے



کاغذ اُچھال کر ذرا تیور ہَوا کے دیکھ
کشتی کو پھر ہَوا کے مخالف چلا کے دیکھ

منظر کی جُستجو ہے تو باہر نکل کے آ
پھل چاہیئے تو پیڑ، ذرا سا ہِلا کے دیکھ

دیوار و دَر نصیب سے مِلتے ہیں ورنہ یاں
سبزے کو ہم ترستے ہیں، شہروں میں آ کے دیکھ

پانی پہ تیرتا نظر آجائے گا کوئی
آنکھوں کی پُتلیوں میں کسی کو بِٹھا کے دیکھ

سانپوں کو پالنے کا ہُنر ہے، یہ شاعری
میرا کلام، نام سے اپنے، سُنا کے دیکھ

رُک جائے وقت پھُول سے چہروں کے درمیاں
بچّوں کے ساتھ شام کو پکنِک مَنا کے دیکھ

بچپن سے جس کا ساتھ رہا سانس کی طرح
ڈولی میں اپنے ہاتھ سے اُس کو بِٹھا کے دیکھ

آئینہ بات کرتا ہے اپنے ہی عکس سے
صورت کو اپنی اس کے مقابل تو لا کے دیکھ

اُڑتے پرند، ڈُوبتا سُورج، پگھلتی ریت
دیوارِ جاں پہ نقش اِک ایسا بنا کے دیکھ

خوش رنگ و خوش لباس و خوش آواز و خوش ادا
ہاتھوں سے اپنے، ایسا پرندہ، اُڑا کے دیکھ

خوشبو، مثالِ برق، چمک جائے گی متین!
لہجے کے پھُول، شاخِ زباں پر کھِلا کے دیکھ



جن سے آواز کا چہرہ نہیں دیکھا جاتا
اُن سے اپنا لب و لہجہ نہیں دیکھا جاتا

پہلے دیکھا نہیں جاتا تھا، پرندہ اِس میں
اب یہ حالت ہے کہ پنجرہ نہیں دیکھا جاتا

جن چراغوں کو ہواؤں سے بچا لائے تھے
اُن چراغوں کو سِسکتا نہیں دیکھا جاتا

چھت کسی کی ہو ٹپکتی نہیں دیکھی جاتی
گھر کسی کا بھی ہو جلتا نہیں دیکھا جاتا

۴۲

جس علاقے میں مرا گھر ہے وہاں سے دیکھو
آگ لگنے پہ بھی شعلہ نہیں دیکھا جاتا

نام لکھ لکھ کے ہتھیلی پہ دِکھاتا ہے مجھے
ہاتھ میں اُس کے یہ کانٹا نہیں دیکھا جاتا

مَیں نے جس شخص کو دریا سے نکالا تھا کبھی
اُس کو دیوار پہ چلتا نہیں دیکھا جاتا

کیوں درختوں کو کھڑے گھورتے رہتے ہو متینؔ
پھل گِرانا ہو تو پتّا نہیں دیکھا جاتا



اِس طرف آگ کا دریا ہے اُدھر کھائی ہے
ہم نے بھی پار اُترنے کی قسم کھائی ہے

اپنے کمرے سے نکل کر ذرا دیکھو تو سہی
دُھوپ، دیوار سے آنگن میں اُتر آئی ہے

جن چراغوں کا ترے نام سے رشتہ ہی نہیں
اُن چراغوں کی زمانے میں پذیرائی ہے

رات کی شاخ سے لٹکے ہیں ستاروں کے چراغ
گھر کی دہلیز پہ بیٹھی ہوئی تنہائی ہے

ایسا موسم ہے کہ بے برگ و ثمر ہیں اشجار
کیوں ہوا شور مچانے کو چلی آئی ہے

دھوپ کے شہر میں بادل کو ترسنے والو
آج بارش نہیں ہوگی یہ خبر آئی ہے

جس پہ دیوار کے اُس پار کا منظر نہ کھلے
ایسی بینائی بھی کس کام کی بینائی ہے

اپنے اندر کا یہ عالم بھی عجب عالم ہے
بھیڑ کی بھیڑ ہے تنہائی کی تنہائی ہے

مجھ پہ الزام ہے آہستہ خرامی کا متین
تیز چلتا ہوں تو احباب کی رسوائی ہے



اِن پرندوں سے سبق سیکھا کرو
شام ہو جائے تو گھر لوٹا کرو

روشنی کی سی اگر رفتار ہو
تب کسی آواز کا پیچھا کرو

نیند جیسی نیند پانے کے لیے
رات ہو یا دِن فقط جاگا کرو

ابر ہو تو خوب برسو، دشت پر
اور شجر ہو تو کہیں سایا کرو

ہاں، تو میں یہ کہہ رہا تھا آپ سے
اپنے اندر بھی کبھی جھانکا کرو

شام، دریا کا کنارا، اور میں
تم، مگر، میرا نہ یوں پیچھا کرو

رات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
دن کی تاریکی کا اندازہ کرو

شام ننگے پاؤں چل کر آئے گی
ریت پر تم نام تو لکھا کرو

پھول کمھلا جائیں گے آواز سے
اپنے بچوں کو نہ یوں ڈانٹا کرو

رات کی دیوار سے لگ کر متین
نیند آ جائے تو سو جایا کرو



اب یہ حسرت ہے کہ منظر کوئی ایسا دیکھوں
شام ہو جائے تو سُورج کو نکلتا دیکھوں

خواب دہلیز پہ آ جائیں تو تعبیر کہوں
ورنہ اِک قطرۂ بے آب میں دریا دیکھوں

چھاؤں جتنی تھی مُقدّر میں، سمیٹی، اب تو
دُھوپ کے شہر میں دیوار نہ سایہ دیکھوں

پھر وہیں سے مَیں سُناؤں گا کہانی اپنی
ہاں مگر شرط یہی ہے، تجھے تنہا دیکھوں

موسمِ گُل ہو کہ پت جھڑ ہو، کوئی رُت ہو مگر
شاخ در شاخ پرندوں کو چہکتا دیکھوں



وہ چنگاریوں کو ہوا دے گیا
سمندر تھا لیکن یہ کیا دے گیا

مَیں جلتے چراغوں کی سانسوں میں ہوں
کوئی جاگنے کی دُعا دے گیا

شکاری بڑا شعبدہ باز تھا
پرندوں کو اِک آئینہ دے گیا

مَیں مقطع پہ پہنچا تو وہ رو پڑا
مجھے شاعری کا صِلہ دے گیا

بڑی دُھوپ تھی گھر کے باہر متینؔ
مگر، وہ شجر، آسرا دے گیا



موسموں کی طرح دل سے مرے جانے والا
یاد آتا ہے بہت، یاد نہ آنے والا

دیکھتے دیکھتے گرتی ہوئی دیوار بنا
رات کی رات وہ دیوار اٹھانے والا

دھوپ آنکھوں میں بسائے ہوئے جیتا ہوگا
پہلی بارش کا وہ موسم نہیں آنے والا

خود ہی تصویر بنا پھرتا ہے شہروں شہروں
تیری تصویر کو آنکھوں سے لگانے والا

سامنے کی اِسی کوٹھی میں رہا کرتا تھا
یہ جو فُٹ پاتھ پہ ہے کھیل دِکھانے والا

تم چراغوں کی لَویں کاٹ کے رکھ دیتے ہو
"میں چراغ اپنی ہی آنکھوں میں بجھانے والا"[1]

آئینہ دیکھ کے روتا رہا تنہائی میں
شہر کے شہر کو آئینہ دِکھانے والا

اُس کی آنکھوں میں مِرے نام کی تحریر ملی
نقش پانی پہ بناتا ہے بنانے والا

چاک پر گھومتا رہتا ہُوں شب و روز متین
ہاتھ آیا نہ کوئی، مجھ کو بنانے والا

[1] یہ مصرعہ مصوّر سبزواری کا ہے۔



آئینہ مانگوں تو کیسی وہ سزا دیتا ہے
لے کے ہاتھوں میں اِک آئینہ دِکھا دیتا ہے

وقت ہے، خواب ہے، خوشبو ہے کہ پیکر کوئی
کون ہے جو مجھے سوتے سے جگا دیتا ہے

ایک بوڑھا گھنے پیڑ کے نیچے بیٹھا
داستاں اپنی پرندوں کو سُنا دیتا ہے

موت کے مُنہ سے کئی بار نکل آیا ہوں
کون ہے جو مجھے جینے کی دُعا دیتا ہے

ایک کمزور سا لمحہ شبِ تنہائی کا
مجھ کو خود اپنی ہی نظروں سے گرا دیتا ہے

دِن کے ہنگاموں میں ہنستا ہوں، چہکتا ہوں مَتین
شب کی تنہائی میں آئینہ رُلا دیتا ہے!



لہجے کو پھول، لفظ کو جگنو، اگر کریں
وقتِ رواں کے ساتھ معانی سفر کریں

اندر کی بارشوں نے جو منظر دکھائے ہیں
باہر کی دُھوپ چھاؤں کو اس کی خبر کریں

موسم، پرندے، دُھوپ کی دیوار، شب چراغ
قصّہ طویل ہونے لگا، مختصر کریں

اب نیند سی ہے نیند، نہ اب خواب سا ہے خواب
سڑکوں پہ جاگ جاگ کے عُمریں بسر کریں

منظر کو درمیان سے اپنے ہٹا کے دیکھ
ممکن ہے پھر مستین کی باتیں اثر کریں



کوئی سایہ نہ خوشبو، مگر دیکھنا
راستوں پر کھڑے ہیں شجر دیکھنا

کشتیو! بادباں کھول دینا ذرا
تیز جھونکا ہوا کا اگر دیکھنا

بارشوں میں پرندوں کے پَر کاٹ کر
اُن کو اُڑتے ہوئے شاخ پَر دیکھنا

سبز پتّوں سے چھنتی ہوئی روشنی
گُل نہ ہو جائے وقتِ سحر دیکھنا

تیری مٹّی ہوں مَیں، تیری مٹّی ہوں مَیں
کُوزہ گر دیکھنا، کُوزہ گر، دیکھنا

۵۵

جن کی آنکھوں میں پانی کی تحریر تھی
اُن کے ہونٹوں پہ رقصِ شرر دیکھنا

بیچ پانی کے سب کشتیاں جل گئیں
پار اُتریں گے ہم اے بھنور دیکھنا

ہم فقیروں کو کیوں چھیڑتے ہو میاں
تم بھی ہو جاؤ گے دربدر دیکھنا

خواب ہی سوچنا، خواب ہی بولنا
خواب ہی دیکھنا، عُمر بھر دیکھنا

گیلے کاغذ پہ کیسے لکھو گے متینؔ
دُھوپ نکلے تو اپنا ہُنر دیکھنا



شعلے بجھ جائیں گے، چنگاری دبی رہ جائے گی
قہقہوں کے بعد آنکھوں میں نمی رہ جائے گی

پانیوں میں عکس، سورج کا پگھلتا جائے گا
شام آنکھوں میں لیے آنسو، کھڑی رہ جائے گی

اک صدائے بے کراں ہے زندگی، اور اُس کے بعد
خامشی ہی خامشی ہی خامشی رہ جائے گی

گفتگو دیوار سے کرتے رہو گے تم اگر،
دھوپ، دروازے پہ رُک کر سوچتی رہ جائے گی

وقت، دریا پار کر جائے گا ہنستے، کھیلتے
تیرے میرے درمیاں، دیوار سی رہ جائے گی

گرتی دیواروں سے لگ کر مت کھڑے رہنا متین
ورنہ ملبے میں دبی اِک چیخ سی رہ جائے گی



یہی نہیں کہ فقط دَر بہ دَر گئے ہوتے
تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو مَر گئے ہوتے

ہمارے پاس اگر کوئی معجزہ ہوتا
تو اِس زمین کو گُلزار کر گئے ہوتے

کُھلی فضا سے زیادہ اگر سُکوں مِلتا
پرندے، شام سے پہلے ہی گھر گئے ہوتے

یہ وہ گلی ہے جہاں آسماں بھی جُھکتا ہے
اب اس گلی سے نکل کر کدھر گئے ہوتے

متینؔ، نسبتِ اسعد[1] اگر نہیں مِلتی
تو مثلِ آئینہ، گِر کر بکھر گئے ہوتے

[1] حضرت قبلہ سیّد اسعد حسین ہارونی مدنی المعروف حضرت دولھے پاشا صاحب قبلہ



خود اپنے شکنجے میں گرفتار نہ ہونا
ہونا بھی پڑے تو سرِ بازار نہ ہونا

دیوار کو ڈھانا بہت آسان ہے لیکن
مشکل ہے کسی کے لیے، دیوار نہ ہونا

اِس راہ میں آگے کوئی دریا بھی ملے گا
تم اُس سے گزرتے ہوئے بیزار نہ ہونا

جانے یہ ہواؤں کی شرارت ہے کہ عادت
موسم کے ثمر کا سرِ اشجار نہ ہونا

ہم جیسے بُرے لوگ بھی یاد آئیں گے تم کو
پردیس میں رہ کر کبھی بیمار نہ ہونا

یہ دام، یہ دانہ، یہ شکاری ہے پرندو
جب پَر ہیں تمہارے تو گرفتار نہ ہونا

مجھ سے مرا سایہ یہی کہتا ہے متینؔ آج
دیوار نہ ہونا، کبھی دیوار نہ ہونا



کیا ہُوا، پُوچھیں، تو وہ، کچھ بھی نہیں کہتی ہے
دُھوپ، دیوار کے سائے میں کھڑی روتی ہے

ریت آنکھوں میں لیے، جاگتے رہنے والے
گھر کی دہلیز، ترا نام لیا کرتی ہے

تم نئے آئے ہو، اِس شہر میں، اِتنا سُن لو
سائیاں اُڑتے ہیں، جب تیز ہَوا چلتی ہے

آسمانوں میں، پرندوں کی طرح اُڑتا ہوں
میرے اِس خواب کی تعبیر بتا، کیسی ہے

کم سے کم دُھوپ میں سایہ تو مجھے ملتا ہے
اِن درختوں سے وہ دیوار بہت اچھی ہے

اُس کا لہجہ ہے کہ پھولوں سے ٹپکتی شبنم
بات کی بات ہے سرگوشی کی سرگوشی ہے

تم سمجھتے ہو، بجھاتی ہے چراغوں کو ہوا
ہم یہ کہتے ہیں، چراغوں میں ہوا جلتی ہے

تم نے پوچھا ہے تو بس تم کو بتاتا ہوں متین
صُبح ہوتی ہے کہیں، شام کہیں ہوتی ہے



دِل جلا پھر، چراغ جلتے ہی
اپنے دُکھ بھی ہیں شام جیسے ہی

کتنے چہرے اُتر گئے دیکھو
دُھوپ دیوار سے اُترتے ہی

موسموں کا پتہ چلا مجھ کو
رنگ دیوار کا بدلتے ہی

ہم نے دریا میں راستہ پایا
اِک ترا نام کے چلتے ہی

زندگی کتنی خوبصورت ہے
ہاں مگر سانس کے اکھڑتے ہی

میر کی یاد آگئی ہم کو
صُبح کرتے ہی شام کرتے ہی

ایک زندہ مثال تھی نہ رہی
ہائے اُس آدمی کے مرتے ہی

ٹوٹنا اپنے دل کا یاد آیا
آئینہ ٹوٹ کر بکھرتے ہی

تیرا لہجہ متین ایسا ہے
پھول جھڑتے ہیں بات کرتے ہی



دُشمن کو بھی یار بنا کر دیکھیں گے
آتش کو گُلزار بنا کر دیکھیں گے

کون عیادت کو آتا ہے، کون نہیں
خود کو اب بیمار بنا کر دیکھیں گے

جوڈو اور کراٹے کا فن سیکھیں گے
ھاتھوں کو تلوار بنا کر دیکھیں گے

بہت ہُوا اب چل کر اپنا گھر ہم بھی
سات سمندر پار بنا کر دیکھیں گے

کیسا پیکر بنتا ہے اِن لفظوں سے
لفظوں کو زرتار بنا کر دیکھیں گے

ٹی۔وی، وی۔سی۔آر، سبھی کچھ ہے گھر میں
اب اِک چھوٹا بار[1]، بنا کر دیکھیں گے

آنکھوں کے دریا میں کون اُترتا ہے
پانی میں دیوار، بنا کر دیکھیں گے

یہ سوچا ہے آئینے میں اب خود کو
سر تا پا اظہار، بنا کر دیکھیں گے

مغنی[2]، مصحف[3]، خالد[4] اور قدیر[5] زماں
اِن پھولوں کا، ھار بنا کر دیکھیں گے

انسانوں کے اِس جنگل میں آج متین!
چہرے کو اخبار، بنا کر دیکھیں گے

[1] MINI BAR
[2] ڈاکٹر مغنی تبسم [3] ممتاز شاعر، مصحف اقبال توصیفی [4] خالد قادری ریڈر انگلش، ویمنس کالج عثمانیہ یونیورسٹی
[5] قدیر زماں، مشہور افسانہ نگار

ٹی۔وی، وی۔سی۔آر، سبھی کچھ ہے گھر میں
اب اک چھوٹا بار[1]، بنا کر دیکھیں گے

آنکھوں کے دریا میں کون اُترتا ہے
پانی میں دیوار، بنا کر دیکھیں گے

یہ سوچا ہے آئینے میں اب خود کو
سرتاپا اظہار، بنا کر دیکھیں گے

مغنی[2]، مصحف[3]، خالد[4] اور قدیرہ[5] زماں
اِن پھولوں کا، ھار بنا کر دیکھیں گے

انسانوں کے اِس جنگل میں آج متین!
چہرے کو اخبار، بنا کر دیکھیں گے

1. MINI BAR
2. ڈاکٹر مغنی تبسم 3. ممتاز شاعر، مصحف اقبال توصیفی 4. خالد قادری ریڈر انگلش، ویمنس کالج عثمانیہ یونیورسٹی
5. قدیرہ زماں مشہور افسانہ نگار


نظمیں

دریا سے بچانا نہ سمندر سے بچانا
دیوار کو، دیوار کے پتھّر سے بچانا

غیاث متین

سفر ہے شرط ـــ

(پاکستانی شاعروں، ادیبوں اور دوستوں کی نذر)

وہ کون تھے ؟
سحاب تھے، کتاب تھے،
مرے ہر اک سوال کا
جواب تھے،
کہ خواب تھے،
وہ کون تھے ؟

ستارے تھے،
کہ آسماں سے روشنی لیے ہوئے
زمیں پہ آ گئے تھے،
میرے واسطے
وہ کون تھے ؟

وہ ہم قلم، وہ ہم زباں
وہ ہم یقیں، وہ ہم گماں
وہ ہم خیال وہم بیاں
٭

وہ یُوں ملے
کہ جیسے حافظے سے یاد،
جیسے تشنہ مٹّیوں سے بارشیں
کہ جیسے شام کو پرند
گھونسلوں سے جا ملیں
کہ جیسے ریگ زار کو
اماں ملے حیات کی
کہ جیسے میری ذات کو
اَذاں ملی ہو ذات کی
وہ یُوں ملے، ـــــ

تُو اے زمین و آسماں کے نُور
میرے مُدّعا
مَیں خواب دیکھتا ہوں،
ڈھُونڈتا بھی ہوں بشارتیں
اُنھیں بھی،
خواب دیکھنے
نظر ملے،
یقیں تراشنے، گُماں سے بھاگنے
ہُنر ملے، سفر ملے

وہ ظُلم ہو کہ خوف ہو
وہ زخم ہو کہ چوٹ ہو
عذاب یا عتاب ہو
اُنھیں بچائے رکھ
تُو اے میرے خُدا ــــــ

مَیں جب مِلوں، تو یُوں مِلوں
وہ جب مِلیں، تو یُوں مِلیں
کہ جیسے صبح، شام سے
کوئی خود اپنے نام سے،
کہ جیسے دُھوپ، چھاؤں سے
غریبِ شہر، گاؤں سے
کہ جیسے لب، دُعاؤں سے

وہ یُوں مِلیں
مَیں یُوں مِلوں
مِرے خُدا،
ہے یہ دُعا
یہی دُعا



زخمی سڑک

مری آنکھیں،
اَٹی ہیں گرد سے پھر بھی
مَیں سب کچھ دیکھ سکتی ہوں۔

زمیں پر،
گاؤں نے،
جب رُوپ دَھارا،
شہر کا
تب سے،
سحر کی آنکھ کھُلتے ہی
اُسے پھر نیند آنے تک،
ہزاروں نقشِ پا بنتے، بگڑتے ہیں
کئی مانوس ہیں اِن میں
کئی ہیں اجنبی لیکن
سبھی یہ چاہتے ہیں،
یاد رہ جائیں زمانے کو۔ ____

سحر کی آنکھ کھُلتے ہی
اُسے پھر نیند آنے تک،
نہ جانے کتنے رکشے، سائیکلیں، موٹر
مجھے یوُں روند کر
آگے کو بڑھتے ہیں،
کہ جیسے مَیں نے اپنا جسم
اُن کو بیچ ڈالا ہے۔

مَیں راہوں کا
مقدّر ہوں،
سِتم دیکھو
مِرے سِینے پہ پھوڑے پھُنسیاں اب بھی
گڑھوں کی شکل میں
پھیلی ہوی ہیں۔

مجھے کچھ یاد آتا ہے
کبھی میں بھول جاتی ہوں
مرے اطراف تھیں
کچھ ٹوٹی پھوٹی ملگیاں کل تک
وہیں پر آج ایسی بلڈنگیں ہیں
جنھیں میں دیکھ کر
حیران بھی ہوں
اور خوش بھی ہوں

سُنا ہے،
مَیں نے یہ اکثر،
سمندر پار مُلکوں میں
مرے ہم جنس، مثلِ آئینہ ہیں.
اور اُس میں
زمیں کے چاند، سُورج،
اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں.

۷۵

اِس اندھے شہر میں
آئینہ بننے کی لیے حسرت
مَیں زندہ ہوں
مگر اب سوچتی ہوں،
کوئی اِک صُور پھونکے
صُور کی آواز سے
ہر شئے پگھل جائے
زمیں مجھ کو بھی
اپنی گود میں لے کر
خلاؤں میں اُڑے،
سُورج سے مل جائے!
○

شہر یارِ امروز

سُنا تھا ہم نے کبھی یہ
کہ شہر یار تھا اک،
وہ شہر یار جہاں
جس کو آرزو تھی، ملے،
صدف کے دِل میں نہاں،
گوہر تبسّم ریز
ستم ہُوا کہ اُسے
وہ گُہر ملے بھی تو یوُں
مثالِ شبنمِ لرزاں، مثالِ ابرِ رواں
بس ایک پَل کو ملے،
دوسرے ہی پَل بچھڑے! ــــــ

وہ شہر یارِ جہاں
راستے کی دُھول بنا
صبا کے پاؤں میں
زنجیر پڑ سکی نہ کبھی
کسی بھی پھول کی خوشبو
اسیر ہو نہ سکی ـــــ

تب اُس نے حکم دیا
"ساکنانِ شہر، سُنو،
ہر ایک شب کی جبیں پر
لکھا ہو میرے لیے
"شبِ عروس ـــــ مگر
ہاں ـــــ سحر کے ہوتے ہی
مثالِ شمع
ہر اک نوعروس قتل بھی ہو" ـــــ

پھر اُس کے حُکم کی تعمیل
اس طرح سے ہوئی
وہ شہر
جو تھا، زمیں پر
نمونۂ جنّت
اُسی پہ شہرِ خموشاں کا
ہو رہا تھا گماں

صبا، زمرّد و نیلم
ہر ایک شب کے لیے
بنیں عروس
سجے بام و در،
سحر ہوتے،
ہوئے تھے قتل
چراغوں کی روشنی کی طرح! —

وہ شاہزادی تھی،
جس نے کیا اسیر اُسے
ہر ایک رات،
نئی ایک داستاں کہہ کر
وہ شہریار ہی تھا،
جو ہُوا اسیر کبھی
یہ شہریار، وہ ہیں
جن کی آستیں کا لہُو
پُکارتا ہے کہ قاتل ہو تم
مسیح نہیں،
نہ جانے کتنے شب و روز کٹ گئے
کہ یہ سب،
کہانیاں بھی سُناتے ہیں
قتلِ عام کے ساتھ !!

○

صدائے طُور

شہرِ ویراں کے مکینو
یہ سُنو
تم فقط،
نَقش بہ دیوار رہے
مجھ کو دیکھو کہ مَیں،
آئینہ بنا
دیکھ رہا ہوں کب سے،
بہتے دریاؤں کے سینے پہ
جو مّلاح ہیں کشتی میں سوار ـــــ

آگ لینے کو،
کئی بار گئے تھے لیکن،
لوٹ آئے تھے لیے، کوئلہ اور راکھ کا ڈھیر
طُور سے آئی صدا

آج حیراں ہوں کہ جب
اُن کی وہ کشتی ہوی
گرداب کے ہاتھوں ہیں اسیر
ڈُوبتے ڈُوبتے
اُبھرے ہیں وہ قندیل بہ کف
جس کے شعلے کی زباں پر ہے لکھا
"مَیں اُجالوں کا نقیب
مُجھ کو تھامے
جو بڑھو گے،
تو سُنو——

آج پھر
طُور سے آتی ہے صدا
شہرِ ویراں کو
جو گُلزار بنانا ہے
تو پھر ——
ڈُوب جانے دو اُنھیں
اپنے کاسے میں لیے،
کوئلہ اور راکھ کا ڈھیر
اور اگر وہ جو کنارے سے لگے
کاٹ کر
شعلۂ اُفزوں کی زباں
پھر سے کرلیں گے
اُجالوں کو اسیر! ——
○

کل جہاں،
دُھوپ میں لپٹی تھی
شبنوں کی رنگت
اور جہاں
خواب میں
دیواریں کیا کرتی تھیں
باتیں خود سے
وہیں
گُونجے گی صدا کی خوشبُو
قہقہے نور کے
بکھریں گے وہیں

وقت

وہ دیروز کی شام
کب لوٹ کر آسکی ہے
نظر جس کی اِمروز و فردا کے چہروں پہ مرکوز ہے
وہی اس سفر میں
اُفق زاد ہے!

پرندے بھی مہمان ہیں موسموں کے
جہاں اُن کو پانی ملے
اُڑ کے اُس سمت جاتے ہیں
پیچھے پلٹ کر کبھی دیکھتے ہی نہیں! ——

عجب یہ تمہارا سفر ہے
عجب یہ تمہاری نظر ہے
کہ صدیوں سے دیرینہ کے اُس کھنڈر پر لگی ہے
جہاں تم کو ملتے ہیں، تاریخ کے
پارہ پارہ سے بوسیدہ اوراق
جن کی نشانی فقط
وقت کے پاس ہے۔

سُنو،
وقت کی آنکھ ہے
وہ سب دیکھتا ہے،
نظر میں ہے اُس کی
زمان و مکاں،
ماورائے زمان و مکاں ــــــ

وقت کے ہاتھ ہیں
وہ اپنے ہی ہاتھوں سے
شکلیں بناتا بھی ہے
اور شکلوں کو لمحوں میں تقسیم کرکے
پھینک دیتا ہے اُن کو،
اَبد کے کنارے پہ ٹوٹی ہوئی،
کشتیوں کی طرح،

وقت کے پاؤں ہیں
وہ، چلتا ہے،
گردش لگاتا ہے
بس، ایک ہی سمت میں
اُس کی رفتار ایسی ہے، جیسے کوئی،
خواب میں،
رات کو،
دِن سمجھ لے!

وقت، آواز ہے،
وقت، احساس ہے،
وقت، پتھر نہیں،
وقت، سیلِ رواں
وقت، محور ہے
جس پر زمیں چل رہی ہے !

وقت، سورج ہے
کرنوں سے اپنی
زمیں کو رُلاتا بھی ہے، اور ہنساتا بھی ہے !

وقت، بارش ہے
طوفاں اُٹھاتا ہے
بیجوں کو، پھولوں، پھلوں تک کا سب فاصلہ
طے کراتا ہے
وقت، سیلاب بن کر پہاڑوں کی چوٹی پہ چڑھتا ہے
پانی میں رستہ بناتا ہے
آتش کو گلزار کرتا ہے
اور رات کی رات سوئی ہوئی بستیوں کو اُلٹتا ہے !——

وقت، موسم ہے،
پت جھڑ کی صورت میں سارے درختوں کے پتّے
گراتا بھی ہے
پھر انھیں،
اِک نیا پیرہن بخش دیتا ہے!

وقت، عادل ہے،
انصاف کرتا ہے،
راتوں میں وہ بھیس اپنا بدل کر نکلتا ہے
حاتم ہے
بن مانگے خیرات کرتا ہے!

وقت، قاتل بھی ہے،
اور مسیحا بھی ہے،
زخم دیتا بھی ہے،
زخم بھرتا بھی ہے!

وقت کو تم اگر جان لیتے
تو، یُوں ریت میں مُنہ چھُپا کر نہ روتے،
زمیں کی کراہیں نہ سُنتے! ــــ

ابھی وقت ہے
اُس کی آنکھوں میں جھانکو
نہ تم وقت کو قید ہی کر سکو گے
نہ تم وقت کے دائرے سے نکل کر
کہیں جا سکو گے!

اَزل اور اَبد کے کنارے بھی
اِک وَاہمہ ہیں
حقیقت تو یہ ہے
اَزل اور اَبد سے پَرے
وقت کا دائرہ ہے

وہ دیروز کی شام
کب لَوٹ کر آسکی ہے!
نظر جس کی اِمروز و فَردا کے چہروں پہ مَرکوز ہے
وہی اِس سَفر میں
اُفق زاد ہے!

○

"وہ قاصد، مر چکا ہے!"

پرندے،
رات کی شاخوں پہ بیٹھے ہیں
پَروں میں
اپنی چونچوں کو دَبائے،
اُونگھتے جاتے ہیں
اور یہ سوچتے ہیں

وہ قاصد،
جو گیا تھا،
صُبح کا چہرہ
کہیں سے مانگ کر لانے،
ابھی تک لوٹ کر آیا نہیں ہے! ——

وہ قاصد،
صُبح کے ہمراہ،
کب آئے گا
کب اس آسماں کے
زرد رُخساروں پہ سُرخی دَوڑ جائے گی

پرندے،
اُونگھتے جاتے ہیں
اور یہ سوچتے ہیں
اُنھیں مُژدہ ——
وہ قاصد،
مَرچکا ہے!
اُنھیں مُژدہ ——
کہ اُن کے پَر سلامت ہیں.

وہ اُتریں
رات کی شاخوں سے اُتریں،
خلاؤں کے سمندر پر چلیں
اور صُبح کو
اپنے پَروں سے
باندھ کر لائیں! ——

○

ریس

وہاں بھاؤ اچھا بلا تھا
کوئی چار چھ' لینتھ کی
بات بھی تو نہیں تھی'
بس آخر میں گردن سے'
گردن ہی کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

وہ جاکی' کہ جس پہ
بھروسہ تھا مجھ کو'
اُسی نے کہیں.....
نہیں ـــــ ایسا ممکن نہیں ہے ـــــ
تو پھر؟ ـــــ

Length ۲/۱ Race

حسب اور نسب
شجرۂ خاندانی،
سبھی دیکھ ڈالا تھا میں نے،
وہ رُستم کا بیٹا تھا،
سُہراب ہی تھا
وہ جس بنچ[1] میں تھا
وہاں کوئی اس کا مقابل نہیں تھا!

وہ چیتے کی مانند اُڑتا تھا،
اور وزن بھی
پیٹھ پہ
اُس کی اتنا نہیں تھا
کہ وہ ہار جاتا
ٹرینر[2] بھی ماہر تھا اس کا
پھر اس کے وہ سب کارنامے .....

[2] Trainer [1] Bunch

اُدھر اس کی فوٹو نکلنے کو تھی
اور اِدھر
دل کی رفتار .....

کوئی چار چھ لینتھ کی بات بھی تو نہیں تھی
وہاں صرف گردن سے گردن ہی کا فاصلہ رہ گیا تھا
چلو مان لیتے ہیں
پھر آج اپنے ستارے ہی اچھے نہیں تھے .
"چلو، آٹو رکشہ سے چلتے ہیں سرکل*"
"نہیں یار، ـــــ
اب اتنے پیسے کہاں ہیں!"

○

* کنگ سرکل ہوٹل، عابڈس

سِم سِم کھُل جا

چلو، اس شہر سے
اور شہر کے لوگوں سے
جتنی دُور ممکن ہو
نکل جائیں،
اُسی جنگل کی جانب
جہاں سے
آئے تھے
ہم تُم!

لکڑہارے،
وہیں کی لکڑیاں کاٹیں
وہیں ریوڑ چرائیں،
دھوپ سے،
سبزے کا
جو رشتہ ہے،
وہ رشتہ اُگائیں
کنوئیں کے میٹھے پانی سے
چراغ اپنے جلائیں۔

لکڑہارے،
یہاں تو،
علی بابا
اور اُس کا بھائی قاسم،
وہ مرجینا ہو یا ہو مصطفےٰ درزی
کہ ہوں چالیس ڈاکو،
سبھی اس شہر کی دیوار میں محصور
سم سم
بھول بیٹھے ہیں؟

لکڑہارے،
طلسم شہر میں اُن کو
یونہی، حیران، پریشان، چھوڑ کر نکلیں
اُسی جنگل کی جانب
جہاں پر،
پرندے ہیں مگر ——
ایسے نہیں ہیں،
درندے ہیں مگر ——
ایسے نہیں ہیں!

○

پرندو، چلو لوٹ آؤ!

تمہیں یاد ہو گا
کہ، اِک دن
تم اپنے درختوں کو
جب چھوڑ کر جا رہے تھے،
تو دریا نے اپنے ہی پانی سے
پانی نے دریا سے سرگوشیاں کیں
(مگر، تم نے تب بھی پلٹ کر نہ دیکھا)

جب اُس پار پہنچے
تو، دریا نہ پانی
فقط ریت ہی ریت تھی!____

ریت کے اُس سمندر سے اُڑ کر
تم اپنی زمیں کی طرف
جب بھی آتے
تو، اپنے پَروں اور چونچوں میں
بس، ریت بھر بھر کے لاتے

پرندو،
تمہیں ریت کو
آبِ زر میں بدلنے کا
اک نُسخۂ کیمیا، مل گیا ہے
اُسی کے پَروں پہ
وہاں، حیرتوں کے نئے آسمانوں میں
تُم اُڑ رہے ہو
مگر.....
اِس زمیں پر
نیا ایک منظر اُبھرنے لگا ہے——

وہ شاخیں
کہ جن پر
بسیرا تمہارا کبھی تھا
وہ شاخیں، پرندو،
ہَوا کے ذرا تیز جھونکے سے ہِل کر
کسی دوسرے پیڑ کی سمت جُھکنے لگی ہیں .

وہ پَودے
جنھیں چھوڑ کر تم گئے تھے،
وہ اب پیڑ بننے لگے ہیں
وہ کلیاں بھی اب
پُھول بَن کر مہکنے لگی ہیں
(وہ بھنورے، جنھیں تم نے دیکھا نہیں
اِن کے اطراف منڈلا رہے ہیں)

یہ منظر،
تمہیں ڈھونڈتا ہے،
پرندو
چلو، لَوٹ آؤ !

○

اپنے آپ سے
ایک مکالمہ!

"نہیں ___ یہ "میں" نہیں ہوں" ___
"میں" ___ نہیں ہوں؟
اور اگر یہ میں نہیں ہوں
کون ہے وہ ___
جو مجھے آواز دیتا ہے،
مری ہی ذات کے اندھے کنوئیں سے،
اور اگر یہ "میں" نہیں ہوں،
کون تھا ___ جو اب نہیں مجھ میں!

وہ "میں" ہی تھا
جو کل
پانی پہ چلتا تھا
ہواؤں پر بھی میری حکمرانی تھی
بلندی سی بلندی بھی،
بہت کم تھی
مری پرواز کے آگے! ___

پرندوں کی زباں آتی تھی مجھ کو
گفتگو کرتا تھا مَیں اُن سے
مَیں کل ـــــ
آواز کے چہروں کو پڑھتا تھا'
سمندر' چاند' سُورج اور ستارے بھی
مرے قدموں میں اپنا سر جُھکاتے تھے'
مگر اب ـــــ مَیں کہاں ہُوں ؟
"ہاں ـــــ وہ تم ہی تھے'
مگر اب تم کہاں ہو؟"

کوئی اب کیوں کر مجھے ڈھونڈے
مَیں خود کو کھو چکا ہوں
آسمانوں سے زمیں کا فاصلہ جتنا ہے
اتنا فاصلہ
خود میرے اپنے درمیاں کیوں آ گیا ہے
وقت دریا کی طرح چلتا رہا
اور یاں کسی نے بھی
مجھے روکا نہیں
اُس سمت جانے سے ! ـــــ

جہاں سے مُڑ کے دیکھا تھا
تو مَیں پتھر بنا تھا
آج بھی پتھر بنا پھرتا ہوں، ہر سُو
اِس زمیں پر
آسماں پر،
اور خلاؤں میں
سمندر پر،
ہواؤں میں
مری وحشت نے مجھ کو،
ہر جگہ رُسوا کیا ہے!

اب کوئی آبِ بقا لا دے،
کوئی میری خبر لا دے
کہاں ہُوں مَیں!——

"کہاں ہو تم"؟
"یہ اپنے آپ سے پُوچھو"
یہ اپنے آپ سے پُوچھوں!
نہیں ___ یہ مَیں نہیں ہُوں
اور اگر یہ مَیں نہیں ہُوں
کون ہُوں مَیں
کون تھا وہ ___
کون ہے یہ ___
جو میرے اندر سے
رَہ رَہ کر مجھے
آواز دیتا ہے!؟

ایک نظم

"زمین والوں کے نام"

ہوا

کچھ ایسی چلی،

کہ خیمے اُکھڑ گئے ہیں!

غبار ایسا غبار اُٹھا

کہ دُھول آنکھوں میں جم گئی ہے

چراغ بھڑکیں،

تو اِس میں اِن کا قصور کیا ہے؟

شمال کی

یہ ہوا،

کچھ ایسی شریر و گستاخ ہے،

جو بڑھ کر

بھڑکنا ان کو سکھا رہی ہے،

جلا رہی ہے،

بجھا رہی ہے،

ہوا کچھ ایسی چلی کہ خیمے اُکھڑ گئے ہیں!

چراغ، دونوں طرف کے،
اِتنے بجھے کہ منظر بھی رو رہا ہے!
سیہ لبادوں، سیہ نقابوں کا راج ہر سُو
کہاں کے رِشتے،
کہاں کے ناطے،
کہاں کے رستے،
کہاں کی منزل؟
چہار سمتوں میں آگ ایسی لگی ہوئی ہے ـــــ
بُجھانا چاہیں تو بڑھ رہی ہے!
بدن دریدہ، کفن دریدہ، پڑی ہیں لاشیں
سَروں سے آنچل،
بدن سے زیور،
اُتر چکے ہیں
جو خواب دیکھے تھے ہم نے
وہ خواب، ـــــ
مر چکے ہیں!
ہوا کچھ ایسی چلی،
کہ خیمے اُکھڑ گئے ہیں! ـــــ

ہمارے گھر میں،
تمام چہرے تھے روشنی کے
تمام چہروں سے روشنی تھی،
وہ غیر تھے!
یہ سُنا تھا میں نے،
مگر میں جن پر
دُعائیں پڑھ پڑھ کے پھونکتا تھا
وہ میرا گھر پھونکنے کو آئے!
بس ایک دیوار بیچ میں تھی ـــــ
وہی پڑوسی بھی آئے،
خنجر بہ دست آئے!
یہ کیسی آندھی چلی کہ چہرے بگڑ گئے ہیں،
ہوا کچھ ایسی چلی کہ خیمے اُکھڑ گئے ہیں!

نہ کوئی اخبار ہے جو کیچڑ میں
پھول جیسا کھلا ہوا ہے
نہ ریڈیو میں، خبر کی خوشبو
نہ دُوردرشن میں ہے وہ منظر
جو مجھ کو،
سُورج دکھا رہا ہے! ـــــ

اِسی زمیں پر
رِشی، مُنی اور نبی بھی آئے
تمام سمتوں کے واسطے
اِک پیام لائے ـــــ
مگر، مَیں اتنا ہی جانتا ہوں
زمین پر ظُلم ہو رہا ہے
زمین والے ہی کر رہے ہیں

وہاں فرشتوں نے سچ کہا تھا،
مگر خدا جانتا تھا سب کچھ
(وہ آج بھی جانتا ہے سب کچھ)
وہ، آسماں سے
اُتر کے ـــــ
اپنی زمیں پر آئے گا،
بھول جاؤ! ـــــ
وہ اپنے ہاتھوں سے،
اس زمیں کو
حسیں بنائے گا،
بھول جاؤ! ـــــ

چراغ اندر چراغ' — تم ہو
کتاب اندر کتاب' — تم ہو
سوال اندر سوال' — تم ہو
جواب اندر جواب' — تم ہو
خدا نے روزِ ازل'
جو دیکھا تھا خواب' — تم ہو

تمہیں سے عزت'
تمہیں سے نکہت'
تمہیں سے شہرت'
زمین کی ہے —

بچا سکو تو
اسے بچا لو

زمین والو —
زمین والو! —

○



مجھے ماضی کا کھِلتے حال سے رشتہ عجب دیکھا
کھنڈر خاموش ہیں لیکن صدا دیتی ہیں دیواریں

غیاث متین

وہ ایسا آئینہ تھا ـــ

ـــ عالم خوند میری کے نام ـــ

وہ موسیٰ تو نہیں تھا
ہاں مگر ـــ جب
اپنی لاٹھی پھینک دیتا تھا
تو وہ بھی
اژدہا بن کر
نگل جاتی تھی سارے اژدہوں کو

وہ موسیٰ تو نہیں تھا
ہاں، مگر ـــ اُس نے بھی
اپنے وقت کے دریا پہ لاٹھی مار کر
اک راستہ اُس میں بنایا تھا ـــ

نہیں ـــــ وہ ابنِ آذر بھی نہیں تھا
لیکن، اُس نے
کتنے ہی بُت
اپنے ہاتھوں سے گرائے،
توڑ ڈالے تھے!

اُسے معلوم تھی،
شئے کی حقیقت
اور اُسے، معلوم تھا یہ بھی
کہ شئے کے درمیاں
اِک آگ رہتی ہے! ـــــ
مگر، اُس کے
لبوں کے درمیاں
بس، پھول کِھلتے تھے! ـــــ

سمندر پی کے تشنہ تھا
چمکتی پیاس تھی،
آنکھوں میں،
باتوں میں
اِک ایسی آس تھی
جو ڈوبتے، بجھتے دِلوں کو بھی،
بھنور سے
کھینچ لاتی تھی،
اُمیدوں کے کناروں پر —

کتابوں کی زمیں پر
جاگتی راتوں میں تنہا
طے کیے کتنے سفر، اُس نے
دُکھتی اُنگلیاں — آنکھیں تھیں اُس کی
بے حسی کے شہر میں — جو
خواب کی دیوار کے اُس پار
سب کچھ
دیکھ لیتی تھیں

وہ ایسا آئینہ تھا،
جس کو پت جھڑ پہ کبھی رونا نہ آتا تھا
گزرتے موسموں سے بھی،
جو آسودہ نہ ہوتا تھا

وہ خوابوں کا تمنّائی
وہ خوابوں کا تماشائی
وہ جس کے واسطے
بس خواب ہی
آنکھوں کی بینائی
وہ جس کی ذات میں
گُم ہو گیا تھا
سحرِ گویائی

جِیا ایسے کہ جیسے پھُول کھِلتے ہیں
بیاباں میں
مَرا — ایسے کہ جیسے دُھوپ ڈھلتی ہے
خیاباں میں —

کتابِ فہم و دانش میں
نگاہِ اہلِ بینش میں
وہ ایسا آئینہ تھا
مُنعکس ہوتی تھی
جس سے دُھوپ بھی
اور چاندنی بھی!

ذہن تھا ایسا،
ہزاروں ذہن
روشن کر دیے جس نے
اور ان ذہنوں کو
اپنی زندگی ہی میں
خود اپنی موت پر
ہنسنا سِکھایا تھا،
وہ ایسا آئینہ تھا.....

○

بولتی لکیریں

(نذرِ مخدوم)

کتابِ زیست ہو
ظلمات ہو
کہ روزن ہو —
شعاعِ مہر کی صورت، وہیں سے پھٹتی ہیں
یہ بات کرتی لکیریں
انہی لکیروں میں
کہیں دھنک ہے
کہیں چاندنی
کہیں خوشبو
کہیں خیال
کہیں خواب
اور کہیں تعبیر! —